مناسب داموں مل جاتا ہے۔ دیہاتی لوگ انٹرٹین منٹ کے طور پر بھی خالص اور دیسی خوراک کو ترجیح دیتے ہیں۔ شہروں میں مہمان کی تواضع کولڈ ڈرنک سے کی جاتی ہے لیکن دیہات میں آج بھی لسی اور دودھ پیش کرنے کا رواج ہے۔ وہاں برگر اور سینڈوچ کے بجائے گڑ اور گنے سے دل بہلایا جاتا ہے۔ پاپ کارن کے بجائے مکئی کے بھٹے چبائے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دیہاتیوں کی صحت شہریوں کے مقابلے میں اچھی ہوتی ہے۔

واہ رے دیہات کے سادہ تمدن کی بہار — سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زرنگار
دل یہ کہتا ہے فراق انجمن سہنے لگوں — شہر کی رنگینیاں چھوڑوں، یہیں رہنے لگوں

دیہاتی زندگی کے غیر مادی پہلو کی طرف آئیں تو اس کا حسن مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔ سادہ لوح کسان صرف اپنے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پورے گاؤں کا رکھوالا ہوتا ہے۔ اسی لیے دیہات میں جرائم کی شرح شہروں کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے۔ اکا دُکا واقعات کے علاوہ دیہی علاقوں میں مثالی امن وامان قائم رہتا ہے۔ خلوص اور محبت جیسی اعلیٰ اقدار کی موت کے اس دور میں بھی دیہات میں لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کچھ ایسا کمزور نہیں ہوا جس کی بڑی وجہ چوپال کا کلچر ہے۔ ہر دیہات میں دو چار ڈیرے ضرور ہوتے ہیں، جہاں شام کا سورج ڈھلتے ہی کسانوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے اور پھر وہ عشا کے بعد تک دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں۔ کاشت کاری کے مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ باہمی تنازعات نمٹائے جاتے ہیں۔ مستقبل کے منصوبوں پر گفتگو ہوتی ہے۔ ملکی حالات پر تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ تاش اور لڈو جیسی تفریحی سرگرمیاں بھی جاری رہتی ہیں۔ گاؤں کی پنچایت چوپال ہی کی باضابطہ اور ترقی یافتہ شکل ہے جس میں دیہاتی لوگ اپنے باہمی تنازعات پیش کرتے ہیں۔ پنچایت گاؤں کے تجربہ کار، عقلمند اور بارسوخ افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور فریقین کے موقف کا مکمل جائزہ لینے کے بعد اپنا فیصلہ سناتی ہے جسے تسلیم کرنا فریقین کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ پنچایتی سسٹم کے باعث دیہاتی لوگ مقدمہ بازی اور عدالتوں کے چکروں میں پڑنے سے بچ جاتے ہیں۔

دیہاتی زندگی کے فوائد شمار کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ شہری زندگی انسان کی تن آسانی اور عیش پسندی کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شہری زندگی میں میسر آنے والی اکثر سہولیات اب ہماری لازمی ضروریات بن چکی ہیں، جن کی تکمیل دیہات میں تقریباً ناممکن ہے۔ شہروں میں معیاری تعلیمی اداروں کی کوئی کمی نہیں۔ پرائمری سکولز سے یونیورسٹی تک سب تعلیمی مدارج آسانی کے ساتھ طے کیے جا سکتے ہیں۔ سائنس، میڈیکل، انجینئرنگ، کمپیوٹر اور اکاؤنٹنگ کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ اسی طرح طالبات کے لیے بھی بہترین تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ طبی سہولیات کے اعتبار سے بھی دیہات شہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمام شہروں میں ہسپتال موجود ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں کے علاوہ ڈاکٹرز کے نجی کلینک بھی عوام کی مسیحائی کرتے ہیں۔ شہر میں ہر چھوٹے بڑے مرض کا علاج ممکن ہے اور کوئی مریض طبی سہولت میسر نہ ہونے کے باعث دوا سے محروم نہیں رہتا۔ شہروں میں فراہمی و نکاسی آب کا بہترین انتظام موجود ہوتا ہے۔ سیوریج کے مناسب بندوبست کے باعث

شعر2: شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

مشکل الفاظ کے معانی: ○ خانۂ دل: دل کا مکان مراد دل

مفہوم: میرے دل میں بہت شور اُٹھا ہے، شاید ابھی کوئی دیوار سی گر گئی ہے۔

تشریح: ناصر کاظمی نے اپنے اس شعر میں اپنے دل کو ایک گھر سے تشبیہ دی ہے گھر کی کسی دیوار کا گرنا بہت بڑے نقصان کی علامت ہے۔ گھر کی دیوار تحفظ کی علامت ہوتی ہے، جس کے گرنے سے تحفظ ختم ہو جاتا ہے۔ چوروں ڈاکوؤں کے راستے کی رکاوٹ دُور ہو جاتی ہے۔ موذی جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے گھر میں آنے کی راہ بھی ہموار ہو جاتی ہے۔ دیوار گرنے سے دیوار کے نیچے دب کر چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں بسا اوقات گھر کے مکین دب کر مر جاتے ہیں۔ شاعر اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو ایک ایسے گھر کی مانند قرار دیتا ہے جس کی دیوار گر چکی ہو۔ عدم تحفظ کا احساس ہے، کوئی کمی سی رہ گئی ہے۔ اب اُسے اپنے دل میں غموں کی یورش کا احساس ہوا ہے۔ دیوار گرنا، دل کے ٹوٹنے کا بھی استعارہ ہے۔ میر تقی میر کا ایک شعر ہے:

؎ دیواریں تنی ہوئی کھڑی ہیں
اندر سے مکان گر رہا ہے

شعر3: بھری دُنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

مفہوم: اس آباد دنیا میں میرا کہیں بھی دل نہیں لگتا۔ اس کے ہوتے ہوئے خدا معلوم کس چیز کی کمی ہے۔

تشریح: ناصر کاظمی نے اپنے اس شعر میں احساسِ محرومی کا اظہار کیا ہے۔ شاعر کے اردگرد کی دُنیا، شاد آباد ہے، خوشیوں سے بھرپور ہے لیکن لوگوں کو شاد اور آباد دیکھ کر اُس کو اپنی محرومیوں کا اور بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ اسے بہت کچھ ملا ہے لیکن کوئی آرزو ایسی ہے جو ابھی پوری نہیں ہوئی۔ شاعر کو اِس کمی کا شدت سے احساس ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اِس کا محبوب ہو جس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ شاعر کو جب کسی ایک چیز کی کمی کا پتا نہیں چلتا تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک سے زیادہ چیزیں، اشخاص یا آرزوئیں ہیں۔

اِس شعر کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ شاعر اس بھری دُنیا میں، آدمیوں کے ہوتے ہوئے، آدمیت کی تلاش میں ہے ہر حساس آدمی کو اِس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انسانوں کی بستی میں انسانیت کی خصوصیات رکھنے والے انسان نظر نہیں آتے۔

شعر4: تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

مشکل الفاظ کے معانی: ○ شریکِ سخن: ہم کلام، باتیں کرنے والا ساتھی ○ خامشی: خاموشی۔

مفہوم: اگر آج تو میرے ساتھ باتیں نہیں کر رہا ہے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مَیں تیری خاموشی ہی سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔

تشریح: ناصر کاظمی نے اِس شعر میں عاشق اور محبوب کے درمیان خاموش فضا کو بھی گفتگو کرتے ہوئے دِکھایا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ دو دوست الفاظ کے سہارے بات نہیں کرتے بلکہ محض دیکھنے کے انداز، پلکیں اُٹھا کر جھکانے، جھکا کر اُٹھانے، چہرہ چھپانے، ہونٹوں کی ہلکی سی لرزش، ہاتھوں کی حرکت، ناخن سے کرسی یا میز کو کُریدنے، زمین پر اُنگلیاں پھیرنے، آنچل سنبھالنے یا آنچل کے پلو کو ہونٹوں میں دبانے، مڑ مڑ کر دیکھنے، سامنے آ جانے پر اچانک آنکھیں بند کر لینے، بند آنکھوں کو نیم وا کرنے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے، چہرے پر کھیلنے والی مسکراہٹ کو چھپانے کی کشمکش، اپنے لباس کو بار بار درست کرنے اور جسم کو دیکھنے کے انداز سے ابلاغ کا کام لیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عاشق کو اِس بات کی ہمیشہ شکایت رہتی ہے کہ محبوب اس کے ساتھ گفتگو کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اسے غرورِ حسن ہو سکتا ہے یا پھر رسوائی کے خوف سے خاموشی اختیار کرنا بہتر سمجھتا ہے لیکن عاشق اس کے ہم کلام نہ ہونے پر بھی مطمئن ہے، کیونکہ محبوب کی ہر ادا سے وہ اپنے مطلب کے معنی اخذ کر رہا ہے۔ جگر مرادآبادی کا شعر ہے۔

؎ کوئی نہ دیکھ سکا جن کو دو دِلوں کے سوا
معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گزرے

شعر 5: یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

مشکل الفاظ کے معانی: ○ **جزیرہ:** خشکی کا وہ ٹکڑا جس کے چاروں طرف پانی ہو جزیرہ کہلاتا ہے ○ **یاد کا بے نشاں جزیرہ:** تصور اور یاد کا وہ حصہ جسے خود دیکھا جا سکتا ہے لیکن کسی دوسرے کو نہیں دِکھایا جا سکتا۔

مفہوم: اے محبوب! یاد کے بے نشاں جزیروں سے تیری آواز ابھی تک آ رہی ہے اور میں اسے سن رہا ہوں۔

تشریح: ناصر کاظمی نے یاد کے بے نشاں جزیرے کی خوبصورت ترکیب استعمال کر کے شعر کو بہت پُرمعنی اور پُرلطف بنا دیا ہے۔ خشکی کا وہ ٹکڑا جس کے چاروں طرف پانی ہوتا ہے ہر آدمی کو دُور سے نظر آ سکتا ہے اور اُس تک پہنچنے کے لیے تیرنے یا کشتی پر سوار ہونے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن یاد کا جزیرہ دراصل انسان کے تصور کی بات ہے۔ اُس کی یادوں کا سلسلہ ہے جو کسی کو دِکھایا نہیں جا سکتا۔ شاعر نے اِسی لیے اسے بے نشاں کہا ہے۔ شاعر تصور میں تو اُس مقام تک پہنچ جاتا ہے جس سے اُس کی یادوں کا تعلق ہے لیکن وہ خود جسمانی طور پر اس مقام تک نہیں پہنچ پاتا یا کسی دوسرے کو وہ مقام نہیں دِکھا سکتا۔ اب غور فرمائیے کہ محبوب اپنے قطع تعلق کے باوجود عاشق کے ذہن سے یادوں کا سلسلہ ختم نہیں کر سکا البتہ تصور ہی تصور میں وہ اس سے ملتا بھی ہے باتیں بھی کرتا ہے اور گزرے ہوئے زمانے میں محبوب سے کی ہوئی باتوں یا خود محبوب کے بولنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی آواز بھی اُس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ بقول مومن خاں مومن:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعر6: شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

مشکل الفاظ کے معانی: ○ **بے چراغ گلیاں:** وہ گلیاں جن میں روشنی نہیں۔

مفہوم: شہر کی اندھیری گلیوں میں عاشق یا شاعر کو اس کی زندگی اب بھی ڈھونڈ رہی ہے۔

تشریح: شہر کی گلیوں میں گھومتے رہنا شاعر کا مشغلہ تھا۔ دن رات ان کا گشت لگاتے رہنا' آوارہ و سرگرداں رہنا' محبوب کی یاد میں اس کے دیدار کی خاطر گردش میں رہنا معمول تھا۔ شاعر کو اس بات کا یقین ہے کہ اس کا محبوب اُسے یاد ضرور کرتا ہوگا۔ یادیں اُسے بھی بے چین رکھتی ہوں گی۔ شاعر کہتا ہے کہ آج بھی وہ' جو میری زندگی ہے میرا محبوب' وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ ممکن ہے شاعر نے بے چراغ گلیاں اس لیے کہا ہو کہ روشنیاں ہونے کے باوجود محبوب کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ اُس کا حسن جلوہ گر نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے اندھیرا محسوس ہوتا ہے۔

اس شعر کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ شاعر کو اُجالا ہونے کے باوجود شہر کی گلیوں میں اندھیرا محسوس ہوتا ہے' یعنی وہ اعلیٰ اقدار کی شمعوں کے بجھنے کو شہر کی گلیوں کا بے چراغ ہونا قرار دے رہا ہے۔

شعر7: وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

مفہوم: اے ناصرؔ! اچھا وقت ضرور آئے گا۔ انتظار کرو' گھبراؤ نہیں۔ ابھی تو ایک طویل زندگی پڑی ہے۔

تشریح: ناصر کاظمی' غزل کے اس مقطع میں رجائی لہجہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ شعر کے مفہوم کی خوبصورتی اس میں بھی ہے کہ کسی بھی خیال کے آدمی کو اُمید دِلائی جا رہی ہے۔ عاشق ہے تو محبوب کی سرد مہری سے نجات کی اُمید' بیمار ہے تو صحتمندی کی اُمید' غریب ہے تو غربت دُور ہونے کی اُمید' ناکام طالب علم ہے تو کامیابی کی اُمید' بے اولاد ہے تو صاحبِ اولاد ہونے کی اُمید' اولاد نافرمان ہے تو اس کے تابع فرمان ہونے کی اُمید' غرض ہر قسم کا آدمی اپنے بُرے دِنوں کے اچھے دِنوں میں بدل جانے کی اُمید قائم کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ دِنوں کو انسانوں کے درمیان پھیرتا رہتا ہے۔ فرماتا ہے کہ ایمان والوں اور صبر کرنے والے لوگوں کو اچھا وقت آنے کی اُمید رکھنی چاہیے۔ اسی لیے آج کا امیر کل غریب' آج غریب ہے تو کل امیر' آج صحتمند ہے تو کل بیمار' آج بیمار ہے تو کل تندرست' آج ناکام ہے تو کل کامیاب' آج کامیاب ہے تو کل ناکام' آج زندگی ہے تو کل موت' غرضیکہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ناصر اپنے دِل کو تسلی دے رہے ہیں کہ آج حالات کتنے ہی ناموافق اور ناگفتہ بہ ہوں' سانس لینا تک دُشوار ہو تو فکر اور غم

ہے، جس سے ماحول اور بھی خوفناک ہو جاتا ہے۔ چوروں، رہزنوں، ڈاکوؤں اور سماج دشمن عناصر کے لیے کام آسان ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مزاحمت کرنے والے راہگیروں اور تاجروں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ پولیس پر لوگوں کا اعتماد پہلے ہی کم ہوتا ہے۔ پولیس کی نفری کم ہونے اور پولیس سے زیادہ جدید اسلحہ ڈاکوؤں کے پاس ہونے کی وجہ سے شہری اور بھی غیر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اپنے تحفظ کے لیے اور جان و مال کی حفاظت کے لیے لوگ اپنے گھروں میں دُبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شاعر نے اپنے دور میں جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ یہ مناظر آپ کو آج کل بھی نظر آتے ہیں۔

شعر 6: ناصرؔ بہت سی خواہشیں دل میں ہیں بے قرار
لیکن کہاں سے لاؤں، وہ بے فکر زندگی

مفہوم: اے ناصرؔ! دل میں بے شمار خواہشیں مچل رہی ہیں لیکن ان تمام خواہشوں سے بڑی خواہش بے فکر زندگی کی تمنا ہے۔

تشریح: انسانی زندگی، خواہشات کے کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے میں محصور رہتی ہے۔ خواہشات کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے میں خواہشات کی نوعیت بدلتی رہتی ہے لیکن ان میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ شاعر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میری بہت سی خواہشات ہیں جو مجھ کو بے قرار رکھتی ہیں۔ میں ان کے حصول کے لیے تگ و دو بھی کرتا ہوں، ہر خواہش پوری ہونے کی فکر میں رہتا ہوں۔ ہر تمنا اور اس کا پورا ہونا اپنی جگہ بہت اہم ہے لیکن سب سے بڑی آرزو ایسی زندگی کی ہے جس میں کوئی فکر نہ ہو کہا یہ جائے گا کہ جس زندگی میں کوئی فکر نہ ہو اس میں تو کوئی خواہش نہیں ہوگی لیکن خواہشوں کے بغیر زندگی کی، بے فکر زندگی کی خواہش کرنا ہی سب سے بڑی خواہش ہے اور شاعر کے کہنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ بے فکر زندگی نہیں ملتی۔ سوچ، فکر، پریشانی اور غم کے بغیر کوئی زندگی نہیں ہے۔ یہاں بے فکر زندگی سے مراد شاعر کی بچپن کی زندگی بھی ہے، جب بچے کی تمام آرزوئیں اور خواہشیں، ماں باپ، بہن بھائی یا عزیز و اقارب پوری کرتے ہیں۔ کوئی معصوم سی خواہش بھی ہونٹوں تک آتی ہے تو ماں باپ اسے فوراً پورا کر دیتے ہیں۔ اسی لیے شیر خوارگی اور بچپن کی زندگی کو بادشاہوں کی زندگی قرار دیا جاتا ہے۔ بادشاہوں کو تو پھر بھی ہزاروں مسائل درپیش ہوتے ہیں لیکن بچہ ہر فکر سے آزاد ہوتا ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ اس کا بچپن لوٹ آئے لیکن یہ ممکن نہیں۔ انسانی خواہشات کے حوالہ سے غالب کہتے ہیں:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مشقی سوالات

1: چند جملوں میں وضاحت کیجیے۔

الف: دل میں اک لہر سی اُٹھنے کا مفہوم کیا ہے؟

شاعر اپنے بیرون کی دنیا میں موسم کی تبدیلی یا حالات کی تبدیلی سے اندرونی کیفیات میں ایک تبدیلی محسوس کر رہا ہے مثلاً بارش ہونے پر، بہار کا موسم آنے پر، کوئی خوش کن منظر دیکھنے پر، کوئی پرانی یاد تازہ ہونے پر، کسی دوست سے ملاقات کا خیال آنے پر دِل میں ایک تازہ اُمنگ، ایک نیا جوش اور کچھ کر گزرنے کا ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی نے اِسی اُمنگ کے پیدا ہونے کو دِل میں اُٹھنے والی لہر قرار دیا ہے۔

ب: خانۂ دِل میں کیسا شور برپا ہے؟

غموں کے ریلے کی وجہ سے دِل میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہوئی ہے، جس کی وجہ سے سارے وجود میں ایک حشر برپا ہو گیا ہے۔ دِل میں دیوار سی گرنے کا مطلب ہے دُکھوں اور غموں کے احساس کو جس قوت نے روک رکھا تھا۔ وہ قوت اب جواب دے گئی ہے اور خانۂ دِل میں اِک شور برپا ہو گیا ہے۔ یہ شاعر کی اندرونی کیفیت کا ذِکر ہے۔

د: خامشی ہم سخن کیسے بنتی ہے؟

جب دو دِل باہم ملتے ہیں تو عاشق اور محبوب کے درمیاں ابلاغ کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو دوسروں کی نگاہوں سے مخفی رہتا ہے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا انداز، کسی بات پر ہونٹوں کی بناوٹ، پلکیں اُٹھانے اور جھکانے کی ادا، آنچل سنبھالنے اور جھٹکے کا طریقہ، ہونٹوں میں پلو کا کونا دبانے کی ادا، یکلخت رُخ کو پھرا کر دیکھنا، عاشق کو دیکھتے ہی خفی سی مسکراہٹ ایسی گفتگو ہے جس کو الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

کل رات زندگی سے ملاقات ہو گئی
لب تھرتھرا رہے تھے مگر بات ہو گئی

ہ: شاعر نے ماضی کی یادوں کو بے نشاں جزیرے سے کیوں کہا؟

محبوب کے ساتھ شاعر کی محبت اور معاملاتِ محبت کے گزرے ہوئے لمحات اور واقعات کی یادیں تازہ ہیں۔ اس نے ماضی کی یادوں کو بے نشاں جزیرے اس لیے قرار دیا ہے کہ محبوب کی طرف سے قطع تعلق کے باوجود یادوں کا سلسلہ قائم ہے۔ مناظر آنکھوں میں گھومتے ہیں اور محبوب کے ساتھ کی ہوئی گفتگو کے مناظر نہ صرف تازہ ہیں بلکہ محبوب کی طرف سے ادا کیے ہوئے الفاظ کی آواز شاعر کو آج بھی سُنائی دے رہی ہے۔ بقول مومنؔ:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

و: زندگی شہر کی بے چراغ گلیوں میں کیا ڈھونڈتی ہے؟

جواب: شہر میں بازار بند ہیں۔ سڑکوں پر آمد و رفت نہیں ہے۔ روشنی نہیں ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ سٹریٹ لائٹس روشن نہ ہونے کی وجہ سے گلیوں میں اندھیرا ہے۔ شاعر چونکہ گلیوں میں گھومنے کا عادی تھا۔ وہ جان کی پروا کیے بغیر اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ اب وہ ان گلیوں میں نظر نہیں آتا۔ شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ زندگی ایسے ماحول میں بھی تجھے تلاش کر رہی ہے۔ یہاں زندگی سے مراد محبوب کی ذات بھی ہے۔

ز: شاعر کے نزدیک وفا کا تقاضا کیا ہے؟

جواب: کوئی شکوہ یا شکایت نہ کی جائے۔ لکھنے والا اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور بولنے والا اپنے ہونٹ سی لے تاکہ محبوب رُسوا نہ ہو۔ وفا کا اب یہی تقاضا ہے:

ع میں اپنے ہاتھ کاٹ لوں، تو اپنے ہونٹ سی

ح: حادثات نے شاعر کو کیسے لوگوں کے درمیان لا پھینکا ہے؟

جواب: وہ بے دِل لوگ جن کی آنکھوں میں مروت اور محبت کی روشنی ہے اور نہ باتوں میں نئے موضوعات کی جھلک، حادثات نے شاعر کو نا اُمیدی اور مایوسی کے حامل لوگوں کے درمیان لا پھینکا ہے۔

؎ کن بے دِلوں میں پھینک دیا حادثات نے
آنکھوں میں جن کی نور، نہ باتوں میں تازگی

2: ناصر کاظمی کی دوسری غزل میں ردیف نہیں ہے۔ محض قافیہ ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ شعر کے لیے ردیف ضروری نہیں البتہ قافیے کا ہونا ضروری ہے۔ آپ اپنی کتاب کے حصہ غزل میں کوئی اور ایسی غزل تلاش کیجیے جس میں ردیف نہ آئی ہو۔

جواب: نصاب میں شامل علامہ اقبالؒ کی پہلی غزل:

؎ جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

4: ناصر کاظمی کی پہلی غزل کے پہلے دو شعروں میں جو تشبیہات استعمال ہوئی ہیں۔ ان کی وضاحت کیجیے۔

ا۔ دل میں اُٹھنے والی لہر کو تازہ ہَوا سے تشبیہ دی ہے۔

- مشبہ: دل میں اُٹھنے والی لہر۔
- مشبہ بہ: تازہ ہَوا۔

○ حرفِ تشبیہ: سی۔
○ وجہ شبہ: لہر اور ہوا میں روانی۔
○ غرضِ تشبیہ: دِل میں اُٹھنے والی لہر کی کیفیت کو نمایاں کرنا۔

ii۔ دل کو ایسے گھر سے تشبیہ دی ہے جس میں کوئی دیوار گری ہو۔
○ مشبہ: دِل۔
○ مشبہ بہ: ایسا گھر جس کی دیوار گری ہو۔
○ حرفِ تشبیہ: سی۔
○ وجہ تشبیہ: دیوار کے گرنے کی آواز اور غموں کی وجہ سے دِل میں ہلچل مچلنے کی کیفیت۔
○ غرضِ تشبیہ: دِل پر غموں کے حملوں کے اثرات کو ظاہر کرنا۔

5: درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

بول اے میرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں — میں جن کو ڈھونڈتا ہوں، کہاں ہیں وہ آدمی
میٹھے تھے جن کے پھل، وہ شجر کٹ گئے — ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی
بازار بند، راستے سنسان، بے چراغ — وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

غزل کے تمام اشعار کی تشریح کر دی گئی ہے۔

☆☆☆

فراق گورکھپوری ــــ (1896ء۔1982ء)

شاعر کا تعارف: فراق گورکھپوری کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ وہ زندگی کی ناکامیوں پر آنسو بہاتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر مسکرانا اور قہقہے بکھیرنا بھی جانتے ہیں۔ وہ انسانوں کو انسانیت کی خدمت کا درس دیتے ہیں۔ غزل کی مخصوص رمزیت اور لطافت کو برقرار رکھتے ہوئے معاشرے میں انقلاب کی خواہش کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ فراق نے ترقی پسند تحریک کا دور عروج دیکھا، پھر ہندوستان کے انگریز سے آزادی حاصل کرنے اور آزاد مملکتوں میں تقسیم ہونے کا بھی مشاہدہ کیا۔ تقسیم ملک کے بعد کے حالات بھی ان کی نظر سے گزرے۔ انہوں نے ان گوناگوں تجربات کو اپنی شاعری میں بہت فنی مہارت کے ساتھ منعکس کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی بھی مسئلے پر بات کرتے ہوئے وہ شاعری کے جمالیاتی پہلو اور قدر و قیمت سے دستبردار ہونا گوارا نہیں کرتے۔

1۔ غزل ــــ فراق گورکھپوری

شعر 1:
اُداسی، بے دلی، آشفتہ حالی میں کمی کب تھی
ہماری زندگی یارو ہماری زندگی کب تھی

مشکل الفاظ کے معانی: ○ بے دلی: زندگی سے بے رغبتی، اُکتاہٹ ○ آشفتہ حالی: پریشانی۔